غلام فرید کاٹھیا کے افسانوں میں جیل کا منظر نامہ

Prison Scenario in the Fiction of "Ghulam Fareed Kathia"

Muhammad Faizan Adil
faizanadilkathiaofficial@gmail.com
Scholar MS Urdu, University of Sialkot, Sialkot, Pakistan
Dr. Khalid Mehmood Ch.
khalidjuut@gmail.com
Unique Science College (Boys) New Muslim Town, Lahore

KEYWORDS

Village
Exploitation
Oppression
Conditions
Reflected
Disrespect
Landlords

DATES

Received	**17-03-2023**
Accepted	**25-04-2023**
Published	**30-06-2023**

QR CODE

ABSTRACT

"Ghulam Farid Kathia" was born in 1939 a village in SAHIWAL district "Murad kay Kathiay".He has been playing his role in literature and politics as well. In his fiction, the problems of backward classes, exploitation and oppression by the landlords have been a great reflection. As every politician in Pakistan has to eat prison air at least once, he has also been sent to prison many times, the effects of which are also seen in his fiction. His book was published "LAMHOO KE QAID" in 2008, in this book a large number of stories are on the subject of prison conditions and their problems. His stories describe not only the prison environment but also hidden crimes. These stories are also seen in psychology and scenes of deep thought. He has reflected the heinous factors behind the treatment of workers, their disrespect and the kindness of the landlords.

DOI:
http://journals.mehkaa.com/index.php/negotiations/article/view/78

تلخیص:

غلام فرید کاٹھیا 1939 میں ساہیوال کے ایک نواحی گاؤں مراد کے کاٹھیا میں پیدا ہوئے۔ وہ ادب کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز 1977 میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو کر کیا اور آج تک اسی سیاسی جماعت کے ساتھ ہی منسلک ہیں۔ بطور ادیب اب تک ان کی تین کتابیں "لمحوں کی قید"، "سفر درپیش" اور "سرسوں کے پھول"

کے نام سے منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے افسانوں میں پسماندہ طبقات کے مسائل، وڈیروں کی طرف سے کیا جانے والا استحصال اور مظالم کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔

ادیب یا شاعر معاشرے کا نرم دل رکھنے والا باشندہ ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اسے لفظوں کے ذریعے بیان کر دیتا ہے۔ غلام فرید کاٹھیا کا تعلق سیاست سے ہے اور کئی بار سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل کی ہوا کھا چکے ہیں۔ ان کے مشاہدات کے اثرات ان کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کی کتاب لمحوں کی قید 2008 میں شایع ہوئی، جس میں افسانوں کی کثیر تعداد جیل کے حالات اور دوران قید آنے والے مسائل کے موضوعات پر ہے۔ شائد یہی وجہ کے ڈاکٹر اصغر علی بلوچ "لمحوں کی قید" کو زندان نامے کا نام دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "غلام فرید کاٹھیا کا تجربہ اتنا جاندار ہے کہ وہ جزئیات نگاری سے جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ---- "لمحوں کی قید" کی کہانیوں پر غور کیا جائے تو اس میں پسے ہوئے طبقے کے مسائل اور سماجی عدم مساوات جیسے موضوعات معاصر زندگی کے آثار بن کر سامنے آتے ہیں۔ کل دس کہانیوں میں سے چھ کہانیوں کا ماحول جیل کی اندرونی فضا کے بارے میں نقاب کشائی کرتا ہے۔"(1)

زندانی ادب ایسا ادب ہوتا ہے جو زندان یعنی جیل میں بیٹھ کر لکھا جائے یا جیل کے مشاہدات و تجربات کو قلم بند کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسی فضا بھی ایک قلم کار کے لیے جیل کا منظر نامہ پیش کرتی ہے جہاں لوگ آزاد رہتے ہوئے بھی مقید دکھائی دیتے ہوں۔ جہاں جبر و تشدد، خوف و دہشت، حبس ہو، جہاں زبان بندی جیسی پابندیاں لگا دی جائیں۔ غلام فرید کاٹھیا سماج کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں غریبوں کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن غلام فرید کاٹھیا اپنے قبیلے سے بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر اللہ یار ثاقب غلام فرید کاٹھیا کے اس رویے سے متعلق لکھتے ہیں:

> "غلام فرید کاٹھیا کا تعلق ایک سیاست دان، جاگیر دار اور وڈیرے طبقے سے ہے مگر جو جذبات، احساسات اور حقیقت پسندی انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنائی ہے وہ ان کے لیے اپنے طبقاتی نظام میں بغاوت کا درجہ رکھتی ہے۔ غلام فرید نے طبقاتی، تہذیبی، سیاسی، ثقافتی، سماجی اور معاشی و معاشرتی زندگی کی عکاسی کی ہے۔"(2)

غلام فرید کاٹھیا کے افسانے نا صرف جیل کا ماحول بیان کرتے ہیں بلکہ ان کے پیچھے چھپے جرائم سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں نفسیات اور گہری فکر کے مناظر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھوں نے محنت کشوں کے ساتھ ہونے والے سلوک، ان کی عزت کی پامالی اور وڈیروں کی شفقت کے پیچھے چھپے گھناؤنے عوامل کی عکاسی کی ہے۔ ان کی یہ عکاسی حقیقی مناظر کو جذائیات نگاری سے بیان کرتی ہے۔

افسانے میں کسی ماجرے کا حقیقی رنگ بھرنے کے لیے جو ساز گار ماحول بنایا جاتا ہے اور کرداروں کے بارے میں لفظی تصویر کشی کی جاتی ہے اُسے منظر نگاری اور جزئیات نگاری کہتے ہیں۔ افسانوی ادب میں منظر نگاری کو بہت اہمیت حاصل ہے جس سے اُس کہانی کے واقعات اور کردار زندہ رہتے ہیں۔ جزئیات نگاری کو بیان کرتے ہوئے پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

"کسی واقعے یا میج کو شاعری یا افسانے میں بیان کرتے وقت اس کے نہایت معمولی حصے کو بھی مد نظر رکھنا اُسے جزئیات نگاری کہتے ہیں۔" (3)

منظر نگاری کے بغیر افسانوی ادب بالکل ادھورا ہے۔ منظر نگاری اس فضا اور اس ماحول کی وضاحت کرتی ہے جہاں کا خمیر داستان، ناول، افسانہ یا ڈرامے کا لیا جاتا ہے۔ ماحول اور فضا کی مطابقت کا بڑا اثر ہوتا ہے اور اگر کہیں مناظر اور کرداروں میں تضاد آ جائے تو وہ تخلیق کو غیر معیاری بنا دیتا ہے۔ آس پاس کے مناظر کو الفاظ میں بیان کرنا مہارت کا کام ہوتا ہے جو فکشن نگار کی کامیابی یا ناکامی کا سبب بن سکتا ہے۔ بعض اوقات مصنف مناظر کی چیزوں کو بڑی تفصیل سے بیان کرتا ہے جس کو جزئیات نگاری کہتے ہیں۔ غلام فرید کاٹھیا کے افسانوں میں یہ مناظر مختلف ماحول کو پیش کرتے ہیں۔ تاہم اس آرٹیکل میں ان کا ایک ہی پہلو منتخب کیا گیا جو جیل کے متعلق ہے۔ بالالفاظ دیگر جس کا زندانی مناظر بھی کہہ سکتے ہیں۔

روز اول سے مرد عورت کا کسی نہ کسی طرح سے استحصال کر رہے ہیں۔ اگر عورت پسند ہو تو اس کو پانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے چاہے کسی کا قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور اگر اس سے نفرت ہو تو اسے زدوکوب کیا جاتا ہے۔ اگر کسی وڈیرے یا طاقتور مرد کو کوئی عورت پسند آ جائے تو اس کے لئے اسے حاصل کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی سب سے پہلے تو دولت کی دھونس جمائی جاتی ہے اور اگر یہ عمل کار گر ثابت نہ ہو تو پھر اغوا جیسی گھناؤنی حرکت ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتی ہے۔ عموماً تو کسی غریب کی اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی کہ وہ کسی طاقتور کے خلاف جا سکے اور اگر کوئی ایک آدھ جرات کر لے تو اسے قتل کروانا یا جیل میں بھجوانا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے ایک کسان جیل میں موجود اپنے ساتھی کو اپنا جرم بتا رہا ہوتا جسے غلام فرید کاٹھیا اپنے افسانے میں کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

"تب میں بھی اُسی کا ہاری تھا۔ اُس نے میری بیٹی اغوا کرائی تھی۔ جب میں نے اپنی بچی کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اس نے اپنے پالتو بدمعاشوں میں سے ایک کو قتل کروا دیا اور قتل میں مجھے سزا کروا دی۔ میری تمام اپیلیں بھی نامنظور ہوئیں اور میں نے زندگی کے طویل پندرہ سال جیل میں تباہ دیئے۔" (4)

یہاں ایک طرف تو ہمیں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ وڈیرے اپنے مزاروں کا استحصال اور ان کی عزتوں کو پامال کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کو مکمل طور تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے وہیں یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں انصاف کا کس قدر بول بالا ہے کہ قتل کوئی کرتا ہے اور سزا کوئی پاتا ہے۔ ہمارے ہاں انصاف کا معیار بھی دولت پر مبنی ہے ایک غریب آدمی بے گناہ ہوتے ہوئے سزا پاتا ہے اور طاقتور گناہ گار بھی ہو تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

جب بھی کسی معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس کے پیچھے کسی ایک فرد کا ہاتھ نہیں ہوتا اس کے پیچھے باقاعدہ لوگوں کی ایک چین سرگرم ہوتی ہے جو چھوٹے سے لے کر بڑے افسر تک سب کو جوڑے ہوئے ہوتی ہے۔ ہر محکمہ میں دو نمبری کا شعبہ سنبھالنے کے لئے مخصوص لوگ ہوتے ہیں جو تمام کارروائی سرانجام دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جیل میں اگر تو کوئی سیاست دان یا کوئی بہت بڑا کاروباری شخص بند ہو تو اسے باقاعدہ ایئر کنڈیشن والا کمرہ دیا جاتا ہے، اس کا کھانا بھی گھر سے بن کر آتا ہے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اسے گھر جیسا مکمل ماحول فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ کھانا بھی دوسرے قیدیوں جیسا نہیں دیا جاتا بلکہ الگ سے عمدہ کھانے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف جو عام قیدی ہوتے ہیں ان کو جتنا ممکن ہو غیر معیاری کھانا دیا جاتا ہے جس کو عام آدمی کے لئے کھانا ناممکن ہے لیکن انہیں زندہ رہنے کے لئے مجبوراً کھانا پڑتا ہے اور کئی لوگ اس کھانے کی وجہ مختلف بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔ غریب آدمی کے لیے جیل کی زندگی کو اتنا اذیت ناک بنا دیا جاتا ہے جس کا عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہاں تو وڈیروں کے کتے بھی اس سے بہتر خوراک کھاتے ہیں، اُن کو گوشت، مکھن اور دودھ سمیت بہترین خوراک دی جاتی ہے صرف اس لیے وہ ایک نسلی کتا ہے اور اس کا مالک ایک ایسا شخص ہے جس کے پاس دولت کی فراوانی ہے۔ چاہے وہ دولت کئی لوگوں کے خون سے رنگی ہی کیوں نہ ہو۔ جیل میں دی جانے والی خواراک کے حوالے سے غلام فرید کاٹھیا "لمحوں کی قید" میں لکھتے ہیں:

> "تمام قیدی اپنے اپنے برتن سنبھالے نمبردار کے پاس اپنا اپنا ناشتہ لے رہے تھے۔ سیاہی مائل بھورے رنگ کا نیم گرم مادہ جسے چائے کہنا کسی طور مناسب نہیں۔ ایک ڈبی یا پیالی کپھیے۔ فی قیدی اور ساتھ ہی ایک پراٹھا۔ نیم گندھے آٹے کی تین چار انچ قطر کی آدھ جلی یا نیم پختہ گُلی ایک عدد فی قیدی۔"(5)

ہمارے جیلوں میں ایسے قیدیوں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے جنہیں قبل از عدالتی کاروائی جیل میں دھکیل دیا جاتا ہے وہ چاہے بے گناہ بھی ہوں انہیں تب تک جیل کی ہوا کھانا پڑتی ہے جب تک عدالت ان کا فیصلہ نہیں کرتی۔ بہت سے لوگ بے گناہ ثابت ہونے پر بری کر دیے جاتے ہیں لیکن ان کی زندگی کا قیمتی وقت قید کی نظر ہو جاتا جس میں انہوں نے ناجانے کیا سوچ رکھا ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے اس میں بچے شامل ہوتے ہیں اور وہ جیل میں دوسرے جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے برائیوں کے عادی بن جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی بوڑھے لوگ ہوتے ہیں جن کی زندگی کے آخری اور قیمتی ایام اسی بات میں گزر جاتے ہیں کہ وہ گناہ گار ہیں یا نہیں۔

جیل میں ایسے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں جنہیں سالوں قید میں رکھنے کے بعد بری کر دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے زیادہ تر تو عادی مجرم بن کر باہر آتے ہیں اور جو دوسرے مجرموں کی صحبت سے بچ جاتے ہیں وہ اپنی تمام تعمیری صلاحیتیں کھو دیتے ہیں۔ اسی طرح افسانہ "لمحوں کی قید" میں شما بھی ایک لمبے عرصے بعد جب بری ہوتا ہے تو وارڈن اسے کہتا ہے اصل ملزم گرفتار ہو چکے ہیں رجسٹر پر دستخط کرو اور رہائی کا پرچہ لو تو اس وقت شمے کے جذبات کی ترجمانی کچھ اس طرح کی گئی ہے:

"زندگی کے وہ قیمتی لمحے جو قید میں کھو گئے۔۔۔ان کا ذمہ دار کون ہے؟۔۔۔پولیس۔۔۔وڈیرے ۔۔۔رحیم داد کا چچا سردار ڈوڈے خان۔۔۔سائیں اللہ ڈوایا۔۔۔یا۔۔۔یا۔۔۔یا۔۔۔اس کا بیٹا کریم بخش۔۔۔کیا کوئی بھی وہ کھوئے ہوئے لمحے لوٹا سکتا ہے۔۔۔۔جب اس نے کہا تھا کہ وہ بے گناہ ہے تو کسی نے یقین نہ کیا تھا۔۔۔سب نے مجھے قاتل سمجھا۔۔۔مگر اپنی زندگی کے قیمتی لمحوں کا قاتل میں کس کو سمجھوں۔۔۔اور ایسے ہی کئی سوال اس کے ذہن میں اُبھر کر مٹتے رہے۔"(6)

بہت ہی کم لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ارد گرد کے برے ماحول میں ڈھلنے کی بجائے اس کے خلاف جاتے ہیں اور مثبت سوچ پیدا کرتے ہیں۔ جیل کا ماحول ایسا ہوتا ہے جس میں ہر ایک ماحولیاتی تبدیلی کا شکار ہوتا ہے، لیکن جو پختہ ارادے رکھتے ہیں ان کے لیے اس کے خلاف جانا بہت آسان ہوتا ہے۔ اگر انسان مثبت اور پختہ سوچ کا حامل ہو تو وہ کسی جگہ بھی جا کر ایسی آب و ہوا بنا سکتا ہے جس کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی ویرانی کے احساس سے نکلنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ جیل میں اپنی بیرک کے اندر ایک پودا لگانا بھی مثبت فضا قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جو شخص فطرت کے جتنا نزدیک ہوتا ہے وہ اتنا ہی پر امید ہوتا ہے۔ فطرت کے حسن کو پہچاننے والا شخص کبھی بھی مایوس نہیں ہوتا اسے خدا کی بنائی ہر چیز میں ایک نئی زندگی نظر آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مایوسی اس کے قریب نہیں آتی۔

افسانہ "زندگی اے زندگی" میں غلام فرید کاٹھیا نے ایک ایسے ہی کردار کو پیش کیا ہے جس کا نام رحموں ہے جو کائنات کے حسن کا پرستار ہے اور خدا کی بنائی ہر چیز سے محبت کرتا ہے اس کے لیے چڑیا کے بچے کی چہچاہٹ سے لے کر بلی کے بچوں کی میاؤں میاؤں تک ہر چیز اس کے لیے جیل کی گھٹن زدہ زندگی میں امید کی کرن کا کردار ادا کرتی ہیں۔ اس کے کردار کو افسانے میں کچھ اس انداز سے سامنے لایا جاتا ہے۔

"رحموں فطرت کا شیدائی اور کائنات کے حسن کا پرستار تھا۔ یہاں پر موجود ہر اس چیز سے پیار کرتا جو فطرت کے حسن میں اضافے کا باعث بنتی ہو۔ وارڈ کے اندر رحموں نے چند مربع گز کے ایک چھوٹے سے پلاٹ میں پھلواری اگا رکھی تھی۔ وارڈ میں لگے پانی کے نل سے اس کی آبپاری کرتا۔ اس وارڈ کے قیدیوں کی خدمت پر مامور مشقتوں سے پھلواری میں گوڈی کرواتا اور خود بھی اس سے فالتو گھاس پھونس نکالتا رہتا۔ جیل کے اندر اس وارڈ کی ویرانی میں اس پھلواری اور شیشم کے درختوں کے سبب قدرے کمی واقع ہو گئی تھی اور یہاں کے تمام باسی رحموں کے اس عمل سے بہت خوش تھے۔"(7)

ایک بات بہت مشہور ہے کہ ہمارے ہاں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے، جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ امیر کسی قدر نہیں چاہتا کہ کوئی غریب آدمی اس کا سامنا کرے۔ اگر طاقتور کسی کو ترقی کرتے دیکھ لے تو مسلسل اس کوشش میں لگ جاتا ہے کہ اس کو کس طرح نیچے گرانا ہے۔ یہاں تک کہ وڈیروں کے پاس کام کر کے اپنا خون پسینہ بہا کر اگر گندم بھی زیادہ اکھٹی کر لیں تو انہیں ذلیل کیا جاتا ہے کیونکہ اگر کسی غریب کے گھر سال بھر کی گندم اکھٹی ہو جائے گی تو وہ وڈیروں کے قدم چومنے نہیں

آئے گا۔ دوسری وجہ ہمارے اپنے ساتھی، دوست اور رشتہ دار ہیں جو ہمیں ترقی کرتا دیکھ لیں تو ان کے پیٹ میں بل پڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کوئی شخص ان سے زیادہ خوشحال ہو اور اگر کوئی محنت اور کوشش کرے تو اس کے خلاف مختلف قسم کی گھناؤنی چالیں چلی جاتیں ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔

افسانہ "چالیس من گندم" میں "بکو" کا کردار ہے جو بڑا محنتی ہے، اپنی محبوبہ شانو سے بہت محبت کرتا ہے، اپنی ماں اور بہن کو خوش رکھنے کے لیے سخت محنت کرتا ہے تاکہ ماں کو خوش رکھ سکے اور بہن کی شادی کروا سکے، لیکن اس کے یہ تمام خواب ادھورے رہ جاتے ہیں کیونکہ وہ محنتی زیادہ ہوتا ہے۔ وہ پورے گاؤں میں سب سے زیادہ گندم اکٹھی کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اگر اس کے پاس زیادہ گندم ہو گی تو اسے سال بھر سرداروں کے تلوے چاٹنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس کے اپنے طبقے کے لوگ ہی اُس کے خلاف وڈیروں کے کان بھرتے ہیں اور اس اس کی بہن کو وڈیرے کے گھر میں چوری کرنے کے الزام میں جیل بجھوانے پر کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایک حاسد کی وڈیرے کے بیٹے کے ساتھ گفتگو کو غلام فرید کاٹھیا نے کچھ اس انداز میں ڈھالا ہے:

> "رحموں نے چوہدری کے بڑے بیٹے سلامت کو ورغلایا۔ "بڑا آیا رقم والا۔۔۔۔ حرام زادہ شانو کا منگیتر بنا پھرتا ہے۔ چھوٹے چوہدری دیکھو نا۔۔۔۔ وہ گدھی کی بچی شانو۔۔۔۔ تمہیں گھاس نہیں ڈالتی۔۔۔۔ اس دن کھیتوں میں کٹائی کے وقت تم نے پیار سے بلایا تھا تو کیسے کاٹنے کو دوڑی تھی۔۔۔۔ ادھر لالی دیکھو تو وہ اپنی جگہ سہتی بنی پھرتی ہے۔ بڑی آئی محنت کار کی بہن کمینی کہیں کی۔۔۔۔ چوہدری سوچو تو ذرا آپ جیسوں کو بھی پُٹھے پہ ہاتھ نہیں دھرنے دیتی۔۔۔۔ مگو چوہدری میں تو اتنا جانتا ہوں۔ دونوں تم سے بچ نہیں سکتی ہیں۔۔۔۔۔ دیکھو چوہدری بکو نے ہماری تمہاری گندم چرائی ہے اسے جیل جانا ہی چاہیئے اور پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ شانو اور لالی۔۔۔ دونوں تمہاری بانہوں میں۔ "(8)

یہاں افسانہ نگار ایسی سوچ کو اجاگر کر رہا کہ کس طرح سے ہمارے معاشرے میں اپنے ہی حسد کی آگ میں اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ بہنوں اور بیٹیوں کی عزتیں تک پامال کرنے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔ دوسری جانب خدانہ کرے کسی وڈیرے کو کسی غریب کی بیٹی، بہن یا بیوی پسند نہ آ جائے پھر وہ اسے پانے کے لیے تمام حدیں پار کر جاتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ دولت کی فراوانی ہے جس کی بنا پر ان کے لیے اغواکاروں کو خریدنا، پولیس والوں کو خریدنا اور قاتلوں سے قتل کروانا کوئی مشکل کام نہیں۔ غربت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ چند پیسوں کی خاطر کوئی بھی کچھ بھی کرنے کو راضی ہو سکتا ہے۔

مظلوم کے ساتھ کھڑا ہونے والا کوئی نہیں ہے اور یہی وجہ کے ہر فرد نا امید نظر آتا ہے اسے دلاسا دینے والا ہی کوئی نہیں ملتا۔ مدد کرنا اور اس کے ساتھ کندھا جوڑ کر کھڑے ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لیے آئے دن جرائم میں اضافہ ہوتا جا رہا اور جرائم پیشہ لوگ دندناتے پھر رہے ہیں۔

کوئی سیاستدان، افسر یا کوئی دولت مند انسان جیل میں ہو چاہے اس نے جتنا مرضی گھناؤنا جرم کیا ہو اسے گھر سے بڑھ کر ماحول دیا جاتا ہے۔ ایئر کنڈیشن، ٹی وی، ہیٹر اور مختلف قسم کے کھانوں سمیت ہر قسم کی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جیل میں دوسرے قیدیوں کے دن کی ابتداہی مار سے ہوتی ہے اور یہ توروٹین کی مار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ذراسی کوتاہی ہو تو جوتوں اور ڈنڈوں کی برسات ان کا نصیب بن جاتی ہے۔ یہ ظلم ہے اور اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھاتا۔ کیا جیل میں رہنا اپنے آپ میں ایک سزا نہیں کہ اس کے علاوہ انہیں مارا پیٹا بھی جاتا ہے۔ ویسے بھی مارا اس مجرم کو جاتا ہے جب وہ پولیس کی حراست میں ہوتا ہے اور اس سے کچھ پوچھ گچھ کی جاتی ہے اور اس کے لئے بھی باقاعدہ ریمانڈ لینا پڑتا ہے۔ لیکن یہ سب کام سلجھے ہوئے معاشروں میں ہوتا ہے، ہمارے افسران بھی ان وڈیروں سے کسی قدر کم نہیں جو عام آدمی پر ظلم کرتے ہیں۔ افسانہ "چالیس من گندم" میں ایسے ہی ایک منظر کو پیش کیا گیا ہے جب بکو کسی دوسرے کے حصے کی مشقت کر رہا ہوتا ہے:

> "ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے دائیں گال اور کان پر کچھ اس زور سے پڑا کہ وہ چکرا کر تھم گیا۔ اس کا کان جیسے بہرا ہو گیا۔ اس کا گال جیسے آگ میں جھلس گیا۔ چہرے کا بائیاں حصہ مکمل طور پر سن ہو گیا تھا۔ وہ دیر تک بڑی حیرت کے ساتھ کارخانے کے ڈپٹی صاحب کو تکتا رہا۔ اسے تو کچھ بھی سجھائی نہ دیا۔"(9)

جیل ایسے مجرموں سے بھرے پڑے ہیں جو حقیقت بے گناہ ہیں اور انہیں کسی نہ کسی جھوٹے الزام میں پھنسا کر عمر قید جیسی اور کبھی تو سزائے موت جیسی سزائیں بھی بھگتنا پڑتی ہیں۔ کیا ایسے لوگوں کا فیصلہ کرنے والوں، ان کے خلاف جھوٹے ثبوت دینے والوں اور جھوٹی گواہی دینے والوں کی کبھی پکڑ نہیں ہوگی؟ کیا وہ بے گناہ لوگوں کی زندگی تباہ کرنے کے باوجود سر فخر سے بلند کر کے چلیں گے کہ انہوں نے بے گناہ کو سزا دی ہے؟ کیا ان لوگوں کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ جب چاہیں، جسے چاہیں، جیسے چاہیں سولی پر لٹکا دیں۔

لیکن ایسا ہو رہا ہے اور تب تک ہوتا رہے گا جب تک پورا معاشرہ اس کے خلاف کھڑا نہیں ہو گا جو کہ ایک ناممکن کام ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں دولت کے بل بوتے پر جھوٹے ثبوت، جھوٹے مدعی اور جھوٹے گواہ خریدنا بہت آسان کام ہے۔ اگر کوئی ایمانداری کا مظاہرہ کرے اور کسی قسم کی دونمبری کرنے یا بکنے سے انکار کرے تو سب سے پہلے کسی اور کو خرید کر اسے راستے سے ہٹایا جاتا ہے اور پھر اپنے مقصد تک بھی رسائی حاصل کر لی جاتی ہے۔ افسانہ "دیوانے لوگ" میں عابو نامی ایک ایسے ہی کردار کو سامنے رکھا گیا ہے جو مزدوری کرتا ہے، اپنی بیوی اور بیٹی سے بہت پیار کرتا ہے ان کو راضی رکھنے کے لیے بھرپور محنت کرتا ہے۔ اس کا ٹھیکیدار ایک کرپٹ انسان ہوتا ہے اور عابو کو اس کے ساتھیوں کے ساتھ سیمنٹ اور بجری لینے بھیجتا ہے۔ جب عابو کو حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ یہ تو دو نمبر کا مال ہے تو وہ ٹھیکیدار کی خواہش کے مطابق چوری نہیں کرتا۔ انکار کرنے کے بعد وہاں سے بھاگنے لگتا ہے تو روکنے والوں میں ایک چوکیدار اور ایک اوورسیر ہوتا ہے۔ اسی دوران ہاتھا پائی میں اوورسیر کے سر پر ڈنڈا لگنے کی وجہ

سے اس کی موت ہو جاتی ہے۔ اس کا قتل کرنے اور اس سے پیسے چھیننے کے الزام میں عابو اور اس کے ساتھیوں کو عمر قید کی سزا ہو جاتی ہے:

"پھر وہ دن بھی عابد کو کل کا دن نظر آنے لگا جب اسے اور اس کے زخمی ساتھی کو عدالت نے اوور سیر کے قتل کے الزام میں عمر قید کی سزائیں دی تھیں۔ ان کا تیسرا ساتھی ان کے جرم میں اعانت کے پانچ سال سزا بھگت کر جا چکا تھا۔ ان تینوں کے خلاف اوور سیر سے سات ہزار چھیننے کے لئے قتل کرنے کا الزام لگا۔ مدعی وہی پھاٹک والا چوکیدار بنا۔ ٹھیکیدار اور ڈرائیور ان کے خلاف چشم دید گواہ تھے جنہوں نے ملزموں کو شناخت پریڈ میں کمال مہارت سے شناخت کر لیا تھا اور جب عدالت نے عابو اور اس کے ساتھی کو عمر قید کی سزا سنائی تھی۔"(10)

ایک عام آدمی جو آزادانہ زندگی گزارتا ہے ہمارے ملک میں اس کے لیے علاج کی سہولت حاصل کرنا بھی ایک ناممکن سا کام ہو کر رہ گیا ہے۔ علاج کے لیے بھی دولت ایسی چیز ہے جس کا سب سے پہلے ہونا ضروری ہے لہذا ہمارے ملک میں اکثریت ایسے لوگوں کی پائی جاتی ہے جن کے پاس علاج تک کے لئے پیسے نہیں ہوتے اور وہ کسی کونے کھدرے میں پڑے اپنی سانسیں پوری کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ پرائیویٹ ڈاکٹروں کی فیسوں کی بھرمار ہے اور دوسرے نمبر پر سرکاری ہسپتالوں میں سہولتوں کا فقدان ہے۔

جیل کی زندگی کے حالات دیکھیں تو وہاں بہت سے قیدی عام سی بیماریوں کی وجہ سے جان کی بازی ہار جاتے ہیں کیونکہ علاج کی سہولیات بہتر ہوں گی تو ہی ان کا علاج بھی ہو گا۔ جیل میں رہنے والا عملہ اور افسران تو پرائیویٹ ڈاکٹروں سے اپنا اور اپنے بچوں کا علاج کرواتے ہیں جبکہ قیدیوں کو مرنے کے لیے بیرک کے کونے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ اپنی سزا ختم کر کے اپنی دنیا میں واپس جانے سے پہلے ہی بیماری کی نظر ہو جاتا ہے۔ یہ تو علاج کی سہولیات کی بات تھی اس سے اگلا مرحلہ یہ کہ علاج جیسا بھی ان کو کروانے کی اجازت تو دی جائے لیکن افسران کو یہ بھی ناگوار گزرتا ہے کہ کسی قیدی کو اتنی اہمیت دی جائے کہ اسے ہسپتال میں پہنچایا جائے اور پھر اس کی دوا کے لئے کسی بھی قسم کی مشقت کی جائے تو ان کی شان کی خلاف ورزی ہو گی۔ افسانہ دیوانے لوگ میں جانو اور عابو نامی دو ایسے کردار ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں جو ہسپتال تک جانے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتے نظر آتے ہیں۔ جانو سخت بخار میں مبتلا ہوتا ہے اور عابو اسے ہسپتال پہنچانے کے لئے ساتھ دو اور قیدیوں کو لیتا اور کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح سے جانو کو ہسپتال پہنچایا جائے تاکہ اس کی تکلیف میں کچھ کمی آسکے۔ لیکن راستے میں ان کا سامنا ہیڈ وارڈن سے ہو جاتا ہے جسے کچھ اس انداز سے بیان کیا گیا ہے:

"ہسپتال کی جانب ابھی چند قدم چلے تھے کہ پیچھے سے ہیڈ وارڈر کی گرج ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

۔۔۔وارڈر نے قریب پہنچتے ہی بیمار جانو کی پیٹھ پر اپنے ڈنڈے کی دھب لگائی جسے عابو نے اپنے بازو پر

روک لیا۔ وارڈنے سیخ پا ہوتے ہوئے عابو کا ڈانٹا" یہ اپنے باپ کو اس وقت کہاں لئے جا رہے ہو" عابو نے کہا "جی جانو کو بہت زیادہ بخار ہے۔ یہ بخار اس کے لئے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے اسے ہسپتال پہنچانے جا رہے تھے تا کہ رات کو دوائی کھا کر سوئے اور شاید کچھ افاقہ ہو جائے۔" اوئے تجھے پتہ نہیں کہ گنتی بند ہونے والی ہے۔ تم نے لال ٹوپی اُتروانی ہے۔ بڈھے کو واپس لے جاؤ۔ کل ہسپتال پہنچانا۔" (11)

رشوت ایک ایسا ناسور ہے جو کسی بھی ملک کو کھوکھلا کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں یہ ناسور سب سے زیادہ پایا جاتا ہے اگر دوسرے ممالک میں بھی ہے تو منظر عام پر بہت کم آیا ہے۔ ہمارے ملک میں اس کام میں سب سے پہلے سیاستدانوں کے نام آتے ہیں اور پھر ان سے شروع کر کے نیچے صفائی کرنے والے تک ہر بندہ اپنی استطاعت کے مطابق کرپشن کرتا ہے۔ اگر کوئی سیاستدان یا بڑا افسر ہے تو وہ کروڑوں میں کرتا ہے اور جیسے جیسے درجے کم ہوتے جاتے ہیں پیسوں کی مقدار کم اور لوگوں کی کرپشن کرنے کی مقدار زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

جیل ایک ایسا محکمہ جہاں شاید سب سے زیادہ اور نچلے درجے کی کرپشن ہوتی اور اس کا سب سے پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی مجرم جیل میں جاتا ہے تو سب سے پہلے اس کی جامہ تلاشی لی جاتی ہے اور اس تلاشی میں نقدی سمیت تمام کام کی چیزیں ملازم اپنے قبضے میں کرتے ہیں اور غیر ضروری چیزیں مال خانے میں جمع کروائی جاتی ہیں جو رہائی کے وقت واپس دی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ملزم سے ملنے کے لئے جو ملاقاتی آتے ہیں ان سے پیسے لیے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کھانے کی چیزوں میں سے بھی پسندیدہ چیزیں جو ملزم کے گھر سے آئی ہوتی ہیں جیل کے اہلکار خود کھا جاتے ہیں۔ جیل میں مجرموں سے مشقت کروائی جاتی ہے اور اس کی اجرت بھی دی جاتی ہے اس اجرت کا اصل مقصد تو یہ ہوتا کہ قیدیوں کی کچھ دادرسی ہو سکے اور وہ اپنے گھر والوں کے لیے یا اپنی ضروریات کے لئے رقم اکٹھی کر سکیں لیکن اس رقم کا استعمال جیل میں موجود چھوٹے سے بڑے تمام اہلکاروں کو رشوت دینے کے لئے کیا جاتا ہے۔ افسانہ "دیونے لوگ" میں ہی جب عابو، جانو کو ہسپتال لے کر جانے میں ناکام ہو جاتا ہے اور ہیڈ وارڈر کی طرف سے اسے سزا دینے کا حکم ملتا ہے تو عابو اسے ہیڈ وارڈر کو بطور رشوت دینے کے لئے ایک پوٹلی دیتا ہے جس میں کچھ رقم اور سگریٹ ہوتے ہیں جنہیں لینے کے بعد ہیڈ وارڈر سزا معاف کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے:

"ہیڈ وارڈر نے ہاتھ بڑھا کر پوٹلی لے لی اور اس کو ہاتھ سے دبا کر پوٹلی کے اندر کے مال کا اندازہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ عابو نے کہا" حضور اس میں دس کا نوٹ اور پانچ پیکٹ سگریٹ ہیں"۔ "ہوں" ہیڈ وارڈر جیسے مطمئن ہو گیا ہو۔" یہ لو چابیاں۔ کل تمہاری پیشی نہیں کروں گا۔ بڈھے کو کل ہسپتال لے جانا اور آئندہ کسی ملازم سے گستاخی نہ کرنا عابو کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ شریفاں جیسے اس کے شریر میں نشہ بن کر چھا گئی۔" (12)

نفسیاتی طور پر دیکھا جائے انسان ہمیشہ سے بڑا مطلبی رہا ہے اور مخلص سے مخلص لوگوں کا بھی نقصان کرنے سے بعض نہیں آیا اور یہ سلسلہ ابلیس سے چلا تھا اور آج تک چلتا آ رہا ہے۔ ہر شخص ہر سطح پر صرف اپنا ہی مطلب نکالنے کی کوشش کرتا ہے اور شائد

یہی وجہ ہے کہ آئے روز انسانیت پر سے اعتبار ختم ہوتا جارہا ہے۔ ایسے ہی ایک نفسیاتی پہلو پر غلام فرید کاٹھیا نے اپنے افسانے "سوچوں کی آگ" میں روشنی ڈالی ہے۔ جہاں سلیم ایک ایسا قیدی ہے جو ہمیشہ جیل کے سنتری فضل کی بیٹی کے علاج کے لئے مدد کرتا ہے اور اس عمل سے فضل خوش بھی ہوتا ہے۔ جب سلیم کی رہائی کا وقت آتا ہے تو فضل اس کی تمام وفائیں بھول کر اس کی رہائی پر صرف اس لئے افسردہ ہوتا ہے کہ اس کے رہا ہونے کے بعد اس کو پیسے کون دے گا:

> "فضل نے سلیم کے جملے سنے تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ پاؤں سے زمین کھسک گئی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ "یااللہ سلیم صاحب بری ہو گئے۔۔۔تو۔۔۔" اس کی زبان گنگ ہو گئی۔۔۔ فضل نے پھر ہمت کر کے دعا مانگنے کی کوشش کی "یااللہ سلیم صاحب کو۔۔۔۔۔بری۔۔۔۔یا۔۔۔۔سزا۔"(13)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو غلام فرید کاٹھیا اپنے افسانوں میں مظلوم کا ساتھ دیتے ہیں اور اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہیں۔ وہ جیلوں میں بند قیدیوں کی ذہنی اور نفسیاتی دونوں انداز میں عکاسی کر رہے ہیں۔ غریب محنت کش مزدور، وڈیرے کے پاس کام کرنے والا ہاری، جیل میں کام کرنے والا کوئی مظلوم اہلکار اور ہر وہ شخص جس کے ساتھ کسی نہ کسی طرح زیادتی ہو رہی اسے انہوں نے نمایاں کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ قانون، انصاف، سماجی مسائل اور ہمارے معاشرے کی تمام برائیوں کو بھی سامنے لا رہے ہیں جن کے بارے میں عام آدمی کچھ نہیں جانتا۔ "منشا یاد"، "غلام فرید کاٹھیا" کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "ان کی زیادہ تر کہانیاں جیل کی زندگی کے بارے میں ہیں یا پھر پنجاب کی طبقاتی، تہذیبی، اور ثقافتی زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ مگر جیل سے متعلق کہانیاں محض جیل کے شب و روز کا احوال ہی نہیں کہتیں، قیدیوں اور جرائم کے پس منظر پر روشنی ڈالتی ہیں۔"(14)

غلام فرید کاٹھیا کے کردار پسے اور کچلے ہوئے ماحول میں پنپتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر کردار عام زندگی سے نکل کر جیل کی زندگی میں منتقل ہوتے ہیں اور پھر وہاں پر ان کے ساتھ ہونے والے سلوک کو بیان کرتے ہیں، کس طرح باہر ان کا وڈیروں اور ظالموں کے ہاتھوں استحصال ہو رہا تھا اور جیل میں آکر بھی وہ قید میں رہتے ہوئے کئی قسم کی سزاؤں کا سامنا کرتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ بھی دیکھنے کو ملتا کہ دولت سے بالاتر کچھ نہیں وہ چاہے عدالتیں ہو، پولیس ہو یا کوئی عام آدمی ہو سب دولت کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور مزید دبنے کی جستجو ان کے اندر ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود "غلام فرید کاٹھیا" رحیموں جیسے کردار کے ذریعے یہ دکھاتے ہیں کہ مایوسی کسی بھی مشکل کا حل نہیں۔ اگر کوئی خود کو مثبت رکھنا چاہے تو وہ کسی بھی چیز سے متاثر ہو سکتا ہے اور اس میں امید کی کرن دیکھ سکتا ہے۔ خود کو مصروف رکھنے اور برائیوں سے بچانے کے لئے بہت سے راستے نکالے جا سکتے ہیں لیکن ان کی طرف جانا بہت مشکل کام ہے برعکس برائی کے

اور مایوسی کی طرف جانے والے راستوں کے۔ وہ یہ یقین دلاتے ہیں کہ اگر ارادے پختہ ہوں تو ہر مشکل مرحلے کو آسانی کے ساتھ پار کیا جا سکتا ہے اور پھر جلد ہی خوشی کی نوید آپ کو سنا دی جاتی ہے۔

حوالہ جات

1. اصغر علی بلوچ، لمحوں کی قید۔۔۔ زندان نامہ (بہاولپور: سہ ماہی کارواں، اپریل تا ستمبر 2011ء)
2. ثاقب، اللہ یار، ساہیوال میں اردو نثر کی روایت (ساہیوال: انور سنز پبلشرز، 2015ء)، 112۔
3. انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع سوم، 2012ء)، 74۔
4. غلام فرید کاٹھیا، مہر، لمحوں کی قید (ساہیوال: فریدیہ پرنٹنگ پریس، 2008ء)، 56۔
5. غلام فرید کاٹھیا، مہر، لمحوں کی قید، 67۔
6. ایضاً، 79۔
7. ایضاً، 92۔
8. ایضاً، 101۔
9. ایضاً، 102۔
10. ایضاً، 111۔
11. ایضاً، 113۔
12. ایضاً، 116۔
13. ایضاً، 122۔
14. منشایاد، غلام فرید کاٹھیا نئے عہد کا افسانہ نگا (اسلام آباد: اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان، جنوری 2011ء)

References in Roman Script

1. Asghar Ali Baloch, Lamhoon ki Qaid….Zindan Nama (Bahwalpur: Quarterly Caravan, April to September 2011)
2. Saqib, Allah Yar, Sahiwal main Urdu Nasar ki Rawyait (Sahiwal: Anwar Sons Publishers, 2015), 112.
3. Anwar Jamal, Professor, Adbi Istalat (Islamabad: National Book Foundation, 3rd Edn, 2012), 74.
4. Ghulam Fareed Kathia, Mahar, Lamhoon ki Qaid (Sahiwal: Fareedia Printing Press, 2008), 56.
5. Ghulam Fareed Kathia, Mahar, Lamhoon ki Qaid, 67.

6. Ibid, 79.
7. Ibid, 92.
8. Ibid, 101.
9. Ibid, 102.
10. Ibid, 111.
11. Ibid, 113.
12. Ibid, 116.
13. Ibid, 122.
14. Mansha Yad, Ghulam Farid Kathia… (Islamabad: Akhbar-e-Urdu, Moqtadara Qumi Zaban, January 2011)